

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## اشارات

حال ہی میں پاکستان میں ایک کتابچہ سویت یونین اور اسلام زبان انگریزی بیسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا ہے۔ کتابچے کے لکھنے والے کمیونسٹ پارٹی ازبکستان کی مرکزی کمیٹی کے سابق سکریٹری مسٹر آرٹین نشانوف (R.N. NISHANOV) ہیں جو اب سیلون میں روس کی طرف سے بطور سفیر تعینات ہیں۔ صاحبِ موصوف چونکہ ایک طویل عرصہ تک ازبکستان کی کمیونسٹ پارٹی کی ایک کلیدی اسامی پرفائز رہے ہیں اس لیے انہیں اس خطے کے مسلمانوں کے رجحانات اور ان کے بچے کچھ نامیہ جذبات اسات سے گہری واقفیت نظر آتی ہے پھر چونکہ وہ اپنے آپ کو کمینوزم کا سچا اور مخلص علمبردار ثابت کرنے کیلئے بھی شدید خواہشمند نظر آتے ہیں اس لیے روس کی مسلم ریاستوں میں "اسلامیت" کا کوئی نشان پا کر انہیں دلی قلق محسوس ہوتا ہے اور وہ اسے اشتراکیت کے لیے عظیم خطرہ تصور کرتے ہوئے مسلم معاشرے میں اسلام کے ایک ایک نشان کو مٹانے اور مسلمانوں کو سوفیصد کمینوزم کا پرستار بنانے کے لیے وہ بعض بڑی موثر تجاویز پیش کرتے ہیں۔

مسٹر نشانوف نے روسی مسلمانوں اور اس ضمن میں پوری دنیا کے اسلام کے حالات کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اس سے ان کے مشاہدے کی گہرائی اور مطالعے کی وسعت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ پھر چونکہ وہ اس وقت سیلون میں ایک اہم عہدے پرفائز ہیں اس لیے انہیں بھارت اور پاکستان کے مسائل سے گہری دلچسپی نظر آتی ہے اور وہ ایک کمیونسٹ کے نقطہ نظر سے ان پر غور کرتے ہیں۔ اس کتابچے کو انہوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام معادۃً ایک بوسیدہ مذہب اور قرآن مجید ایک ایسی بوسیدہ کتاب ہے جس سے معاشرے کے کمزور طبقوں کا

استحسان کرنے والوں کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اسلام چند غیر عقلی توہمات سے عبارت ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو دانش کو اپیل کرے۔ اس مذہب نے ہمیشہ کمزور طبقوں کو دبانے اور برباد کرنے میں طاقتور طبقوں کے ہاتھ میں ایک سمجھتیار کے طور پر کام دیا ہے۔ جنت و دوزخ، حشر و نشر سب اعتباری باتیں ہیں جن کا مقصد سادہ لوح عوام کو محض فریب دینا ہے۔

سب سے پہلے اسلام کی تعریف "نبینہ"۔

”و اسلام دنیا کا غیر علمی رجعت پسندانہ تصور ہے جو مارکس لینن کے علمی تصور سے متصادم ہے۔ اسلام دانشور اکتیت کی رجائیت پسندانہ اور حیات آفریں مادی تعلیمات کے بالکل مخالف ہے اور سوویت یونین کے باشندوں کے مفادات سے مغائرت رکھتا ہے۔ یہ مسلمانوں کو اشتراکی معاشرہ کی تعمیر میں موثر کردار ادا کرنے میں فراہم ہوتا ہے۔ قرآن مجید خلیفہ کے ہمہ گیر داروں اور بڑے بڑے تاجروں کو خوش کرنے کے لیے تصنیف کیا گیا، اس میں جنت و دوزخ کے جو قصے درج ہیں ان کا مقصد فردوں کو بے بس غلاموں میں تبدیل کرنا ہے۔ مسلمانوں کے مقدس تہوار خصوصاً عید الاضحیٰ اور صیام رمضان اُس دور کے باقیات ہیں جب انسان اس امر کا یقین رکھتا تھا کہ وہ جادو کے ذریعے دیوتاؤں اور بدروحوں کو خوش کر سکتا ہے۔ حج عرب کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی آمدنی کا ایک ذریعہ ہے اور اب استعمار پسند حج کے موسم کو حاسنوں اور منتشار پسندوں کو بھرتی کرنے کیلئے ایک اچھا موقع تصور کرتے ہوئے اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ قرآن و سنت کی تعلیمات دنیا کی ساخت اور اس کے وجود کے بارے میں قدرت کی کرشمہ ساز یوں کے متعلق نہایت گمراہ کن نظریات پیش کرتی ہیں۔۔۔۔۔ قرآن قوانین فطرت اور قوانین معاشرت کی نفی کرتا ہے اور ان کی جگہ اس اسول کا پرچار کرتا ہے، ”خدا اپنی منشاء کے مطابق کائنات کو پیدا کرتا اور اپنی خواہش کے مطابق اسے چلاتا ہے۔“

اس طرز فکر سے، یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے کہ قرآن کے مستنبین اس چیز سے بے خبر تھے کہ منابر قدرت کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اسلامی ادب نگاہ جسے خدا کی مرضی کہا جاتا ہے وہ فطری ربط و ضبط ہے۔۔۔۔۔ جس وقت

قرآن تصنیف کیا بار بار تھا، نہ صرف اس کے مصنفین بلکہ اس کے مخاطب بھی مظاہر قدرت کے بارے میں بہت کم واقفیت رکھتے تھے اور جو چیز ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی اس کے متعلق یہ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اینجیل نے کہا ہے: اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں ناقابل ادراک مظاہر قدرت کو حادثہ کا نام دوں یا خدا کا۔ یہ دونوں نام میری کم علمی کے مظہر ہیں اور ان کا علم سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں۔ جہاں علت و معلول کی کڑیاں مفقود ہوں وہاں علم کے وجود کا کس طرح تصور کیا جاسکتا ہے؟ (ص ۹-۱۱)

اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے مصنف اسلام اور سائنس کے درمیان کسی سمجھوتے کو بالکل ناممکن سمجھتا ہے اور جو لوگ اس قسم کی کوششوں میں مصروف ہیں انہیں ویوانہ خیال کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک سائنس انسان کی شعوری قوتوں کو بیدار کرتی ہے جبکہ مذہب انسان کے ذہن کو تاریک بناتا اور اسے فطرت کی قوتوں کے سامنے بے بس ہو کر زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے اس سے اس کی تخلیقی جدوجہد میں کمی آتی ہے۔ ص ۱۱

پھر مصنف کو اسلام سے یہ بھی شکایت ہے کہ وہ مسلمانوں کو ماضی کی طرف رجوع کرنے کا درس دیتا ہے اور انہیں یہ بتاتا ہے کہ اُن کی تاریخ کا روشن دور ماضی میں ہے اسی سلسلے میں وہ اُس گہوارِ جنت کا بھی مذاق اڑاتا ہے جس میں سب سے پہلے حضرت آدم اور حوا کو رکھا گیا۔ مین تخلیق انسان کے اس سب سے اہم واقعہ کو ایک لغو قصے سے تعبیر کرتا ہے۔ مگر نشانہ کے الفاظ میں مسلمانوں کی اس ماضی پرستی کے نقصانات یہ ہیں:

”اسلام کے ”سنہری زمانہ“ کے تصور نے گروہِ ارضی پر تنظیم نو کے لیے جدوجہد کو کافی حد تک پہنچایا ہے۔ یہ تو درحقیقت غلامی، بے بسی اور انسانی محنت کی فتح و کامرانی میں بے یقینی کا ایک وعظ ہے۔“ ص ۱۲

قرآن حکیم اور اُس کی تعلیمات سے سرسری واقفیت رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ اس

کتابِ الہی نے انسانی عز و شرف کا جس قدر پرہ چار کیا ہے وہ دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا۔ اس نے انسان کو اُس کے بلند مرتبہ سے آگاہ کیا اور اُسے بتایا کہ وہ اس زمین پر خدا کا نائب ہے اور ساری کمالات اُسی کی خدمت اور چاکری کے لیے پیدا کی گئی ہے مگر یہ عجیب المیہ ہے کہ کتابچہ کے فاضل مصنف کو قرآن مجید میں انسان کی تذلیل کے سوا کوئی دوسری چیز نظر نہیں آئی۔

”قرآن انسان کے عز و شرف، اُس کے ذہن، اس کی عظمت اور اُس کی تخلیقی قوتوں کے بے پایاں ممکنات کو کم کرتا ہے۔ قرآن کی رُو سے انسان خواہ کتنی ہی محنت کرے وہ کوئی اچھی چیز پیدا نہیں کر سکتا۔ قرآن دنیوی زندگی اور انسان کے معاملات کو محض طفل نسلی اور جھوٹی شان و شوکت سے تعبیر کرتا ہے۔“

اس تہید کے بعد مصنف قرآن مجید سے اُن آیات کو نقل کرتا ہے جن میں آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی چند روزہ زندگی کی بے وقعتی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد ان آیات سے بالکل غلط نتائج اخذ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”اگر ہم قرآن پر اعتماد کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اصل فرض اجتماعی اعتبار سے مفید محنت کرنا یا مختلف ممالک کے عوام کے دوش بدوش کھڑے ہو کر بہتر اور شاد کام زندگی کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا نہیں جس سے فوری اور مباشرتی استبداد کا خاتمہ ہو بلکہ قرآن کی تعلیمات کی رُو سے انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ مصائب یعنی استحقاق کرنے والوں کے ظلم و ستم کو برداشت کرے۔ اور قرآن اُن کی توجہ معدوم جنت میں اخروی فلاح کی طرف مبذول کرانا ہے۔ یہ سماع دشمن اور عوام دشمن سرگرمیاں ہیں۔ ان کا مقصد مزدوروں کو معاشرہ کی تنظیم نو کے لیے طبقاتی جدوجہد سے الگ رکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رجعت پسندانہ حکمرانیوں اسلام کی حمایت پر کمر بستہ ہوتی ہیں۔“

اسلام ایک طبقاتی معاشرے کا مذہب ہے اس میں جنت کا عقیدہ استحقاق کرنے والوں کے حقوق کی پاسبانی کرتا ہے۔ قرآن مومنوں کو جنت میں ٹھنڈک، آسوگی اور سیاہ پلوں والی حوروں کی بشارت دیتا اور اسے فوری عظیم قرار دیتا ہے۔ حیات

بعد ازاں کی جس قدر تعلیمات ہمیں قرآن میں ملتی ہیں اور مسلمانوں کو حُسنیت میں نوازشات کے جس قدر وعدے کیے گئے ہیں یہ سب ایک ایسے سماج کے تصورات ہیں جس میں استحقاق کا دور دورہ ہو۔ قرآن اس استحقاق کو قدرتی، مرنجیائی قرار دیتا ہے اور اس بات کا وعید دیتا ہے کہ انسانی طبقاتی استبداد، غلامی کو خود خدا نے قائم کیا ہے۔ ... ۱۵

مُصنّف سورۃ الزمر کی آیت ۲۳ کا غلط ترجمہ درج کر کے اپنی طرف سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے: ”قرآن کی رو سے اسلام ایک ایسے مذہب کی نمائندگی کرتا ہے جو استحقاق کرنے والوں کا موید ہے۔ ذاتی ملکیت اور معاشی نا انصافی کو قرآن محفوظ دیتا اور ان دونوں کو وہ رحمت الہی سے تعبیر کرتا ہے۔۔۔۔۔ قرآن غریبوں اور سکیوں کو اس بات سے ڈراتا ہے کہ امراء کی جائداد کے خلاف کوئی کوشش کر کے اپنے مصائب کو بدلنے کی جدوجہد کریں۔۔۔۔۔ اس طرح غربت و افلاس، تمہیداً انسانی مصائب، معاشرتی نا انصافی اور غلامی قرآن حکیم کی رو سے خدا کی نظر میں پسندیدہ اعمال ہیں۔“ ۱۶-۱۵

مشر نشانہ کو اس بات سے بھی سخت کرب و اضطراب محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے عقیدہ کی بنیاد پر انسانیت کی شیرازہ بندی کی ہے۔ اُس نے نوع بشری کو امیر اور غریب کے درمیان تقسیم کرنے کے بجائے کفر و اسلام کی بنیاد پر تقسیم کیا ہے۔ اسلام کے ماننے والے خواہ کسی ملک، کسی نسل اور کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، ایک برادری کے افراد ہیں جسے قرآن حکیم نے امت و مسلک کہا ہے اور خدا اور رسول کا انکار کرنے والے خواہ وہ کسی رنگ اور نسل کے ہوں اسلامی نقطہ نظر سے ایک قوم ہیں چشمِ فلک سے آج تک انسانیت کی شیرازہ بندی کی اس سے بہتر کوئی دوسری بنیاد نہیں دیکھی کہ نیکی، پاکبازی، خدا خونی ایک طرف ہو اور کفر و ضلالت اور شر و فساد دوسری طرف ہو۔ اس ایک بنیاد کے علاوہ ہر دوسری بنیاد باطل ہے۔

اُستراتیجیت کی نظر میں یہی بنیاد سب سے زیادہ غلط اور قابلِ نفرت ہے۔ وہ انسانیت کو غربت اور امارت کی بنیاد پر دو گروہوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہے۔ مشر نشانہ نے مختلف مقامات پر اس بات کا رونا رویا ہے کہ مسلمان قومیت کے اس آفاقی تصور سے ابھی تک نا آشنا نہیں ہوئے، اُن کے تحت الشوری میں

عقیدے کی بنیاد پر ملت کی شیرازی بندی کا تخیل آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ مسٹر نشانوہ کے الفاظ میں  
 اس تخیل سے استحصاال پسندوں نے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ پاکستان کے وجود کو بھی مصنف اسی رجعت  
 پسندانہ تصور کا ایک منظر خیال کرتا ہے۔

”اسلام نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کے مابین نفرت کے جو بیج بوئے ہیں اُسے استحصاال  
 کرنے والوں نے مشرق میں قومی آزادی کی تحریکوں کو کمزور کرنے کے لیے خوب استعمال کیا  
 ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۷ء میں برطانوی استعمار پسندوں نے مذہب کی اساس پر بھارت  
 اور پاکستان کی تقسیم کر دی“ ص ۹۰

مسٹر نشانوہ اس بات سے بھی سخت برہم ہیں کہ قرآن مسلمانوں کو آپس میں اخوت اور بھائی چارہ  
 قائم کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور سطح انہیں طبقاتی کشمکش سے الگ کر کے غریبوں کے حقوق پامال کرنے کا ذریعہ بنتا  
 ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے قرآن مجید کی آیات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی اس شرمناک  
 انداز میں تحریف کی ہے کہ انسان حیرت زدہ ہو کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا کوئی علم کا دعویدار پستی کی اس سطح تک  
 بھی جا سکتا ہے۔ ہم یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور فرمان ہے  
 کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس فرمان کے ساتھ احادیث میں یہ تصریح بھی موجود ہے  
 کہ اس پر حضور کے جان نثاروں نے آپ سے یہ بھی دریافت فرمایا کہ حضور مظلوم کی مدد کا معاملہ تو سمجھ میں آتا  
 ہے مگر ظالم کی امداد سمجھ میں نہیں آتی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم کرنے سے باز رکھو۔  
 آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اور یہ تصریح احادیث کے قریب قریب سارے مجموعوں میں موجود  
 ہے مگر نشانوہ کی بدویانہ ملاحظہ ہو کہ اُس نے حدیث کے صرف پہلے کٹرے کو درج کیا ہے، یعنی مدد کرنا اپنے  
 مسلمان بھائی کی خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ دوسرے حصے کے متعلق وہ یہ کہتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ الفاظ  
 تصنیف کیے انہیں خود بھی ان کے سماج دشمن ہونے کا احساس ہوا اور انہوں نے بعد کے الفاظ شامل کر لیے  
 مگر ان کا مدعا اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں کو طبقاتی کشمکش جو معاشرتی اور قومی حقوق کے تحفظ کے  
 لیے برپا کی جاتی تھی باز رکھا جاتے اور اس طرح انہیں استحصاال پسندوں، نوآبادکاروں کے سامنے سترنگوں  
 رہنے کی تعلیم دی جاتے اور انہیں ہمیشہ غلامی، افلاس اور کھوک کو برداشت کرنے پر آمادہ کیا جاتے۔  
 مسٹر نشانوہ نے اس بات پر تاہم کیا ہے کہ مسلمان عہد جدید میں قومیت کے اس تصور کو زندہ کرنے اور زندہ رکھنے

کی کوشش کر رہے ہیں اور مارکس کے کیٹل کے بجائے قرآن مجید کو اپنانے کی تلقین کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں مصنف اُن لوگوں کی کوششوں کو بھی بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اسلام اور اشتراکیت کے درمیان پیوند کاری میں مصروف ہیں یا اسلامی تعلیمات کو اشتراکی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ وہ اس قسم کی کوششوں کو بالکل لغو قرار دیتا ہے کیونکہ اسلام اور اشتراکیت کے مابین کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے قدر مشترک کہا جاسکے، اس لیے جو لوگ ان کے درمیان ملاپ کرانے کے آرزو مند ہیں وہ مسٹر نشانور کی نظر میں اشتراکیت کی راہ کھوٹی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کا نقطہ نظر ملاحظہ ہو:

”قرآن کے اخلاقی اور قانونی ضابطے اور اس کا نظام شریعت جس طرح کہ اس طبقہ کا معاشرہ میں نشوونما پاتی ہے، استحصال پسندوں کے مفادات کی ترجمانی کرتا ہے اس نظام کا حقیقی انسانیت پرستی سے کوئی دور کا تعلق نہیں۔ وہ انسانیت پرستی جو کہ اشتراکیت کے معماروں کے ہاں ملتی ہے جو ایسے اخلاقی اصولوں سے عبارت ہے جن کی بنا پر عوام کے تعلقات باہمی عزت و احترام پر استوار ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے سوئٹ یونین کے عوام کے مابین دوستی اور اخوت کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے“ ص ۲۴-۲۵

مصنف کو اس بات سے تو کسی قدر خوشی محسوس ہوتی ہے کہ سوئٹ یونین کا مسلمان اپنی مذہبی روایات کو خیر باد کہہ رہا ہے مگر اُسے یہ دیکھ کر دکھ بھی ہوتا ہے کہ وہ پورے طور پر اشتراکی بننے میں متامل نظر آتے ہیں۔ ان مسلمانوں کا ایک اچھا خاصہ حصہ اس بات کا متمنی ہے کہ وہ اسلام کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے۔ اس لیے وہ مختلف تاویلات کے ذریعے اسلام اور اشتراکیت کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم عنان رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں مصنف اس نعرے ”کل مسلم اخوة میں ایک عظیم خطرہ محسوس کرتا ہے اور مسلمانوں کے اندر اس نعرے کو رواج دینے کا حامی ہے؟ مسلمان ایک دوسرے کے کامریڈز ہیں۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اخوت کے لفظ سے ذہن شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کے تصویریت کی طرف پھٹتا ہے اور کامریڈ کے لفظ کے استعمال سے مسلمانوں میں اشتراکی تصور قومیت

کو قوت فراہم ہوتی ہے مٹر نشا نو و جہاں کہیں بھی اسلامی بیداری کا کوئی معمولی نشان بھی پاتے ہیں تو انہیں سخت اذیت پہنچتی ہے مثال کے طور پر انہیں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سویت مسلمانوں کے اندر قرآن مجید کے پڑھنے کا رجحان پھر سے پیدا ہو رہا ہے یا وہ اپنی روح کی تسکین کے لیے اندسہ نو مذہبی رسوم ادا کرنے لگے ہیں تو وہ چونک پڑتے ہیں اور اشتراکیت کے علمبرداروں کو کسی بہت بڑے خطرے کی دہائی دیتے ہیں۔ انہیں اسلام کے تصور خدا میں ایک آمر کی روح نظر آتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس تصور کے رواج پانے سے جاگیر داری اور سرمایہ داری کا زور بڑھے گا۔ انہیں اس بات سے بھی خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے میں ابھی علماء کا وقار باقی ہے۔ اور لوگ اپنی معاشرتی زندگی خصوصاً شادی بیاہ کے معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کو بیان کرنے کے بعد مٹر نشا نو و اپنی پوری توجہ روسی مسلمانوں کی طرف منبذل کرتا ہے۔ وہ اس بات کو پوری طرح ذہن نشین رکھ کر اپنی بات آگے بڑھتا ہے کہ صدیوں پرانی روایات جو مسلم معاشرے میں اپنی جڑیں دُور دُور تک پھیلا چکی ہیں اور صدیوں پرانے اعتقادات جو مسلمانوں کے قلب و دماغ میں اچھی طرح پیوست ہو چکے ہیں انہیں یخ و برف سے اکھاڑنا کوئی سہل اور آسان کام نہیں اس کے لیے بڑی حکمت و دانائی اور تدبیر کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں سویت حکومت کو اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن افسوس کہ مسلمان ابھی تک اشتراکیت کے صحیح معنوں میں پرستار نہیں بن سکے۔ ان کے خیالات ان کی مذہبی رسومات، ان کے معاشرتی اداروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ابھی تک دین کی کچھ ذہنی چنگاریاں موجود ہیں جو ذرا سی ہوا دینے سے فوراً بھڑک سکتی ہیں اس لیے سویت حکومت کے یہ سچے خیر خواہ سب سے پہلے ان اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی وجہ سے مذہب کی کچھ چنگاریاں باقی رہ گئی ہیں اور پھر ان تدابیر کا ذکر کرتے ہیں جن سے انہیں بالکل راکھ بنایا جاسکتا ہے۔

مٹر نشا نو دسب سے پہلے زار روس کی کوتاہی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُس نے مسلم علاقوں کو روسی نوآبادیوں میں تبدیل کرنے میں بڑی ہمت کا ثبوت دیا مگر اُس نے حماقت یہ کی کہ اسلام سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ مسجد کی حمایت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ”ملا“ کو مسلم معاشرے میں کافی حد تک بالادستی حاصل رہی اور اس طرح

کوئی ہمہ گیر انقلاب پوری کامیابی کے ساتھ برپا نہ کیا جاسکا۔

پھر اشتراکیت کے ان علمبرداروں سے دوسری فروگزاشت یہ ہوئی کہ وہ قومی رسومات اور روایات کو مذہبی اثرات سے دانشمندی کے ساتھ بچانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ مسلمانوں کے قومی تہواروں اور اداروں پر اسلام کی چھاپ کسی نہ کسی صورت میں باقی رہی۔ مٹرنشانو کے خیال کے مطابق مسلمانوں کو پوری طرح متحد بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایسے انتظامات کیے جاتے جن سے لوگ دین حق سے برگشتہ ہوتے اور دین اشتراکیت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرتے۔ اس ضمن میں جتنی تدابیر بھی کی گئیں ان میں سے بعض انہیں بڑی پسند ہیں، مثلاً اپریل ۱۹۲۳ء کے ماہ صیام میں ایک ایسا پروگرام ترتیب دیا گیا جس سے عوام کے ذہنوں میں اس مقدس مہینے کی عظمت ختم ہو اور مسلمان اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے اور تزکیہ نفس کی تربیت حاصل کرنے کے بجائے خدا کے باغی اور نفس کے بندے بن سکیں اس پروگرام کی تفصیل ذرا مصنف کی زبان سے ملاحظہ فرمائیں :

”اپریل ۱۹۲۳ء میں شہری اور علاقائی پارٹی کی کمیٹیوں نے پارٹی کی ساری ابتدائی تنظیموں کو مذہب کے خلاف پروپگنڈے کے لیے پوری طرح استعمال کیا، خصوصاً ماہ رمضان میں ان سے خوب کام لیا گیا۔ اس ماہ کے آغاز سے پہلے غریب کسانوں کے اشتراک سے نہایت خوبصورت قہوہ خانے قائم کیے گئے۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس مہینے میں لوگ قہوہ خانوں میں جاتے، وہاں مختلف قسم کی مجالس منعقد ہوتیں جن میں اہم سیاسی اور معاشی اور مقامی معاملات زیر بحث آتے۔ ان مجالس میں تجربہ کار انقلابی نہایت دلچسپ انداز میں سامعین سے خطاب کرتے۔“

مٹرنشانو کے خیال کے مطابق چونکہ مسلمانوں کو پوری طرح اشتراکیت بنانے میں کئی قسم کی کوتاہیاں ہوئی ہیں اس لیے وہ سو فیصد ملحد اور زندگی نہیں بنے۔ ان کے معاشرے میں ابھی تک کچھ علامات ایسی موجود ہیں جن سے رجعت پسندی کا اظہار ہوتا ہے مصنف کو سب سے بڑا دکھ اس بات کا ہے کہ ابھی تک ”ملا“ پوری طرح درست نہیں ہوا اور وہ حکومت کی شدید مذہب دشمنی پالیسی کے باوجود ان علامات کی حفاظت کر رہا ہے اس سلسلے میں ذرا ان کے اضطراب کا اندازہ لگائیں :

”بعض مسلمان علاقوں میں ایک شخص اکثر اوقات شادی بیاہ، بچے کی پیدائش اور موت پر مذہبی رسومات کو دیکھتا ہے۔“ ص ۴

پھر مصنف کو سب سے زیادہ کوفت اس بات سے ہوتی ہے کہ ان مذہبی روایات کو صرف جاہل عوام ہی سینے سے نہیں لگا رہے بلکہ بعض اوقات بڑے اونچے اور پڑھے لکھے مسلمان بھی انہیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصنف کے ارشاد کے مطابق :

”بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ان مذہبی رسومات کو علمی پیشہ سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلم آبادی کے ایک علاقے میں جسے اندیزبان کہا جاتا ہے ۱۹۶۸ء میں جن مسلمانوں نے شریعت کے مطابق نکاح کیا ان میں ستر کی تعداد میں محکمہ تعلیم سے تعلق رکھنے والے ۶۲ طلباء اور دس ڈاکٹر تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ زبانی طور پر تو سائنٹفک فلسفہ کے حامی ہیں مگر عملی زندگی میں وہ مذہب سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اشتراکی نظام کو نقصان پہنچاتے ہیں اور ان کا طرز عمل عوام کے اذہان پر ضرر رساں اثرات مرتب کرتا ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جبکہ بعض اشتراکیوں نے اپنی انفرادی زندگی میں مذہب کے ساتھ ایک صلح پسند رویہ اختیار کیا۔ یعنی مذہبی رہنماؤں کے بتائے ہوئے غیر انسانی افعال کے ساتھ سمجھوتہ کیا اور بعض اوقات انہوں نے مذہبی رسوم بھی ادا کیں۔

اس قسم کی باتوں کا وجود ناقابلِ برداشت ہے چنانچہ ازبکستان کی اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ایسے تمام لوگوں کو سخت سرزنش کی اور جماعت کی جملہ تنظیموں کو حکم دیا کہ وہ کمیونزم سے تعلق رکھنے والوں سے پارٹی کے اصولوں کی بلاچون و چرا پابندی کرنے کا مطالبہ کریں۔

اشتراکیت چونکہ ایک مکمل عنایطہ حیات ہے اس لیے اسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ مذہب کسی شکل میں بھی اشتراکی معاشرے میں باقی رہے کمیونزم کے سچے خیر خواہوں کو وہ کوششیں بھی کھلتی ہیں جو اشتراکیت کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے بعض لوگوں نے وقتاً فوقتاً کی ہیں۔ مگر نشانہ نو د کو اس میں

یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ مذہب کو اگر غیر عقلی عناصر سے پاک کر دیا گیا تو اس میں اپنے آپ کو علمی نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور یہ رجحان عوام کو پھر مذہب کا گرویدہ بنا دے گا۔ مسٹر نشا نوڈ کو اس بات سے بھی کد ہے کہ اسلام نے اخلاق کی جو آفاقی قدیں پیش کی ہیں یعنی امانت دیانت، بزرگوں کا احترام، صبر و استقلال، چوری اور زنا سے پرہیز، اُن کا بھی پرچار کیا جائے کیونکہ اُس کے خیال کے مطابق ان قدروں کے زندہ رہنے سے مذہب کی زندگی میں اضافہ ہونے کا خطرہ ہے۔ مسٹر نشا نوڈ ان قدروں کے حفظ و تباہی کی کوششوں کو ملا کی انٹراکٹیت کے خلاف گہری سازش سے تعبیر کرتا ہے۔

اس کتابچے کے آخری حصے میں مصنف نے مسلمانوں کو انٹراکٹیت کے رنگ میں پوری طرح رنگنے کے لیے بعض تجاویز بھی پیش کی ہیں جن کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

ان کی پہلی تجویز یہ ہے کہ اسلام کی براہِ راست مخالفت نہ کی جائے بلکہ ایسے افکار و نظریات کا پوری کوشش سے پرچار کیا جائے جن کے پھیلنے سے اسلامی تعلیمات بالکل تارکب خیالی بن کر رہ جائیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مذہب اور سائنس کے مابین جو عظیم فرق ہے اسے نوجوان نسلوں کے اچھی طرح ذہن نشین کرایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ سائنس کو مذہب سے وہی تعلق ہے جو روشنی کو تاریکی سے ہوتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو بیک وقت کسی طور بھی اپنا نہیں جاسکتا۔ اگر انسان کو علم کی روشنی مقصود ہے

تو پھر اسے مذہب کی جہاتوں سے اپنے آپ کو بچا نا پڑے گا۔ چنانچہ جب بھی انٹراکٹیت کا پرچار اس سائنٹفک انداز میں کیا گیا تو اس سے بڑے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوتے مثلاً پہلی جنگ عظیم سے ہتھیر سوٹ یونین میں ۳۵۰۰۰ مساجد بھٹیں مگر اب ان کی تعداد کم ہو کر صرف چند سو رہ گئی ہے اور ان میں بھی زیادہ عبادت کے لیے نہیں بلکہ دوسری تقریبات کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان مساجد کے بجائے اب وہاں ہزاروں یونیورسٹیاں اور مدارس قائم ہو چکے ہیں جو شب و روز محمدانہ تعلیم دینے میں مصروف ہیں۔

مسٹر نشا نوڈ گنایاں کامیابی پر خوش نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ کام زیادہ وسیع پیمانے پر اور زیادہ منظم طریق سے سرانجام دیا جائے کیونکہ مسلم آبادی کے ایک بہت بڑے حصے نے انٹراکٹیت کی فلسفہ کو دل و جان سے قبول نہیں کیا۔ اس لیے وہ اپنی نجی زندگی میں اس دین کسی نہ کسی طرح وابستہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ